انسانی معاشرہ اور نظم قضاء- اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک جائزہ

تحریر: ڈاکٹر شمس البصر' ایسوسی ایٹ پروفیسر' شعبہ علوم اسلامیہ'
اسلامیہ یونیورسٹی' بہاولپور

معاشرے میں قیام عدل کی اہمیت سے کسی بھی صورت میں انکار نہیں کیا جاسکتا- عدل کے قیام ہی سے معاشرے پروان چڑھتے ہیں- لوگ ایک دوسرے کے دستبرد سے محفوظ ہوتے ہیں- اسی سے معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بنتا ہے- مہذب معاشروں اور ریاستوں نے مختلف زمانوں میں صرف ظلم کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے- بلکہ ظلم کی ناپسندیدگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ عدل کی اہمیت کو اجاگر بھی کیا ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل کے قیام کے بغیر پرامن زندگی گزارنے کا تصور بھی ممکن نہیں عدل وانصاف کے قیام ہی کے ذریعے معاشرہ میں اطمینان وسکون اور امن وآشتی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے اسی سے نہ صرف ظلم وجبر کا مداوا کیا جاتا ہے بلکہ مطمئن آسودہ' پروقار اور پرسکون زندگی گزارنا ممکن بنایا جاسکتا ہے-

مختلف معاشروں کو مہذب بنانے میں زیادہ تر عمل دخل مذہب کا ہی رہا ہے- اور مذہب کی بنیاد الہامی ہے- اور یہی الہامی بنیاد دراصل اسلامی ہی ہے- اس وجہ سے جس طرح اسلام ہمیشہ سے ظلم کو ناپسند قرار دیتا چلا آرہا ہے اسی طرح ان معاشروں نے اسی اثر کے نتیجے میں اسے ناپسند قرار دیا ہے-

آج دنیا میں عدل کے قیام کیلئے Judiciary کا ادارہ موجود ہے- اسلامی اصطلاح میں اسے قضاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- قضاء دراصل اس فیصلے یا حکم کو کہتے ہیں جو کسی بااختیار ادارے یا قاضی (Judge) کی جانب سے صادر ہو-

یہ دنیا دارالامتحان ہے اس میں حق وباطل کا وجود اس کی اہم خصوصیات میں سے ہے- اللہ تعالیٰ انسان کو حق اور راست بازی کی طرف جبکہ شیطان اسے باطل اور گمراہی کی طرف بلاتا ہے- حب مال' حب اولاد اور آسائش کے حصول کی محبت جبلت بشریہ میں ہے- اس وجہ سے ان تمام کے حصول کیلئے وہ ہر وقت کوشاں رہتا ہے- اس سلسلے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی خاطر زیادیوں کا ارتکاب ممکن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپس میں لڑنے جھگڑنے کی نوبت بھی آجاتی ہے- قرآن کریم نے انسان کی اس جبلت کی طرف یوں اشارہ کیا:

''وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَشَیْءٍ جَدَلًا''(۱) (اور انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے)

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے:

''اَوَلَمْ یَرَالْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاہُ مِنْ نُّطْفَۃٍ فَاِذَاھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ''(۲)

(کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو ہو گیا)

انسان اپنی ضروریات، تعیّشات، پسند اور ناپسند کیلئے مقررہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اگر اس کو اپنی اس حالت پر چھوڑ دیا جائے تو معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا۔ اسی فساد، جھگڑوں، تنازعات اور اختلافات کو ختم کرنے کیلئے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو ان تمام اختلافات کو احسن طریقے سے نمٹائے۔ وہ قوت قضاء ہی کی ہو سکتی ہے جس میں عدل ہوتا ہے اور اس کے نفاذ کی طاقت بھی۔

انبیاء علیہم السلام، معاشرے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیلئے مبعوث ہوئے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا یہی فریضہ پوری انسانیت کو سونپا گیا۔ اسی حوالے سے اس آخری امت کی بعثت کا بنیادی مقصد امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی قرار دیا گیا(۳)

نواب صدیق حسن خان رقم طراز ہیں:

''قداتفق المسلمون اجمعون علی وجوب الامر بالمعروف والنھی عن المنکروقالوا:انھماعمادان الاعظمان من اعمدۃ ھذاالدین وانھما واجبان علی کل فرد من افراد المسلمین وجوباًوضیقاًفالقاضی القادرعلی الحکم بالحق والعدل وبماانزل اللہ-واذااستنع من الدخول فی القضاء فقداھمل مااوجبہ اللہتعالیٰ علیہ من الامر بالمعروف والنھی عن المنکر وترک اعظم مااوجبہ اللہ تعالی علی عبادہ واھم ما کلفھم بہ''(۴)

(تمام مسلمان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وجوب پر متفق ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ اس دین کے ستونوں میں سے دو بڑے ستون ہیں اور مسلمانوں میں سے ہر فرد کے اوپر انتہائی طور پر فرض ہیں۔ پس قاضی مبنی برحق، عدل کے ساتھ اور اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم دینے کا مجاز ہے۔ قضاء کو قبول کرنے سے انکار کی صورت میں وہ اللہ کی جانب سے عائد کردہ امر بالمعروف

ونھی عن المنکر کے فریضہ سے غفلت برتتا ہے- اور اس اہم ترین فرض کو ترک کرتا ہے- جس کا اللہ نے اپنے بندوں کو مکلف بنایا ہے)

امر بالمعروف ونھی عن المنکر کا مقصد معاشرہ کو عدل پر قائم کرنا ہے جبکہ عدل کے قیام کیلئے قضاء ایک وسیلہ ہے- قضاء کے بغیر عدل کا قیام نہ صرف مشکل ہے بلکہ بعض اوقات ناممکن بھی- قضاء ہی کے ذریعے صحیح وغلط' جائز وناجائز اور حق وناحق کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاسکتا ہے- یہی وہ ضرورت ہے جس سے قضاء کی افادیت ثابت ہوتی ہے- کیونکہ ظالم کو ظلم سے روکنا' قوی اور ضعیف کے تنازعی امور کو نمٹانا' یہ اور اس جیسے بے شمار امور ایسے ہیں جو کہ ادارے کے بغیر انجام نہیں دیئے جاسکتے- اسلام اس مقصد کے حصول کیلئے خاطر خواہ انتظام کرتا ہے- وہ لوگوں کو جائز وناجائز' حق اور ناحق کی تعلیم بھی دیتا ہے اور اس سلسلے میں اپنے ضابطے کے نفاذ کی ذمہ داری بھی ان پر عائد کرتا ہے-

اس حوالے سے منصب قضاء وہ فرض حکم ہوا جو کہ اقامت کیلئے لازم کیا گیا ہے- اسلامی معاشرے میں ان مقاصد کے حصول کیلئے امام یا حاکم کا تقرر واجب قرار دیا گیا ہے جبکہ امام ریاست کے جملہ امور کی انجام دہی بذات خود نہیں کرسکتا- اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے اختیارات میں سے بعض اختیارات دوسروں کو سونپے- ان سونپے جانے والے امور میں سے اہم ترین امر منصب قضاء ہے- اس لئے کہ اس سے لوگوں کے درمیان عدل قائم ہوتا ہے- اور عدل کا قیام حکومت وقت کے اولین فرائض میں شمار ہوتا ہے-

معاشرہ میں عدل اس وقت قائم ہوتا ہے جب ہر مستحق کو شریعت کے مطابق اس کا حق دیا جائے- انبیائے کرام علیھم السلام کو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ قیام عدل کا فریضہ بھی سونپا گیا تھا- ارشاد ربانی ہے:

''لَقَدْاَرْسَلْنَارُسُلَنَابِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَامَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمُ النَّاسُ بِالْقِسْطِ''(۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب میزان کو نازل کیا تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)

یہاں میزان سے مراد وہ معیار حق وباطل ہے جو ٹھیک طرح سے ترازو کے پلڑے برابر کردے- عدل وانصاف کے حوالے سے لوگوں کے جان ومال' عزت وآبرو کے تحفظ کیلئے قضاء وہ واحد ادارہ ہے جو اگر خدا کے دیئے ہوئے ضابطے اور قانون کے مطابق چلایا جائے تو معاشرہ جنت

ارضی بن سکتا ہے- اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے:

''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ''(۶)

(ابتداء میں لوگ ایک ہی طریق پر تھے (پھر اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے- اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں لوگوں کے مابین جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کریں)

قضاء کی ضرورت واہمیت

انسان فطری طور پر اجتماع پسند ہے اور معاشرے سے الگ تھلگ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا- وہ معاشرے کا محتاج ہے- علامہ ابن خلدون کہتے ہیں:

''اجتماع انسانی ایک ضروری اور ناگزیر شے ہے اسے حکماء اپنی اصطلاح میں ''مدنی الطبع'' کے نام سے یاد کرتے ہیں- اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کی ایک اکائی کی حیثیت سے اس کے ساتھ منسلک رہے اور اپنی حاجات اور ضروریات زندگی اس معاشرے کے اندر رہتے ہوئے ایک دوسرے کے تعاون سے پورا کرے- یہ بھی یاد رہے کہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے مختلف امور کی انجام دہی میں معاشرے کی دوسری اکائیوں کے ساتھ اس کے اختلافات ایک فطری امر ہیں اور بعض اوقات ناگزیر بھی- انمیں ایک دوسرے کے حقوق' معاملات' حق وناحق' صحیح وغلط' قوت وضعف' اطاعت وعدم اطاعت اختلاف ومفاہمت جیسے تمام امور شامل ہیں- اپنے محدود ذرائع معلومات سے جائز وناجائز یا صحیح وغلط کا فیصلہ کرنا اس کیلئے دشوار ہے جبکہ ان تنازعات واختلافات کو حل کیے بغیر زندگی اس کیلئے مصیبت کا باعث بن سکتی ہیں- (۷)

جناب غلام مرتضے آزاد اپنی کتاب ''The Judicial Systam of Islam'' میں رقم طراز ہیں: (۸)

The comission of errors is inherent in human nature. This leads of comision of wrong, that effects the rights of the people

and some times causes breach of peace in the society. The clashes of interests creates disputes among them. It reguires an authority to decide their disputes. Hence the people resort to arbitrament so that peace and prosperity may prevail. This function of administration of justice is called Qada in the teminalogy of Islamic Law.

''غلطیوں کا ارتکاب جبلت انسانی میں ہے- یہی جبلت اسے ناجائز کام پر ابھارتی ہے جن سے لوگوں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں-بعض اوقات معاشرے کا امن اسی وجہ سے تہہ وبالا ہوجاتا ہے- مفادات کا ٹکراؤان کے درمیان تنازعات پیدا کردیتا ہے-ان کے تنازعات کے حل کیلئے ایک بااختیار طاقت کی ضرورت ہوتی ہے-لوگ امن وسکون کے قیام کیلئے ثالثی کی طرف لپکتے ہیں-عدل وانصاف کا یہی طریقہ اسلامی قانون کی اصطلاح میں قضاء کہلاتا ہے-''

جب کبھی معاشرہ افراتفری کا شکار ہو-لوگوں میں اختلافات رونما ہوں صحیح اور غلط کا تعین مشکل ہوجائے- جائز وناجائز کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہ ہو-تو ایسے میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت انتہائی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے جو باہمی تنازعات اور اختلافات کو ختم کرے اور معاشرے کی بدنظمی اور بگاڑ کو درست کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہو-

ڈاکٹر ناصر بن عقیل الطریفی فرماتے ہیں:

''منذان خلق اللہ الانسان واوجده على هذه الارض لم نجد ولم نعلم ان احداًاستغنى بمفرده عن الناس الاخرين فقام بجميع مصالحه وحاجاته وحده فالانسان لا بدمن جماعة يعيش ويتعاون واياهاً -فالاجتماع الانسانى ضرورى " ويعبرعن هذا الحكماء بقولهم :الانسان مدنى بالطبع

والجماعةلاتكون مجتمعاًالااذااصبحت بينهم روابط اسريةومالية‌وسياسةوغيرهاوهذه الروابط والعلائق لابد ان يكون لها تنظيم حتى تنضبط الاموروبكون واضحة والا سادت الفوضى وعم الدمار وانهارصرح الجماعةولم يتحقق المجتمع‘واكل القوى الضعيف فالنفوس متباينة النزعات والاهواء فمنهامن لايلتزم جانب الحق ولا يعرف معنى العدل‘‘(۹)

(جب سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی ہے اور اسے زمین پر بسایا ہے کسی فرد کی دوسرے افراد سے الگ تھلگ اور بے پرواہ رہنے کی مثال نہیں ملتی کہ اس نے اپنے تمام مصالح اور حاجات خود پورے کیے ہوں- پس انسان کیلئے معاشرے کے ساتھ رہنے اور تعاون کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں- یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرے کی ضرورت مسلم رہی ہے- اور اسی وجہ سے حکماء انسان کا مدنی الطبع ہونا ثابت کرتے ہیں- کوئی بھی جماعت اس وقت تک مجتمع نہیں رہ سکتی جب تک ان میں خاندانی‘ مالی‘ سیاسی اور دوسرے تک کہ- روابط پیدا نہ ہوں- ان کے تعلقات اور روابط کیلئے تنظیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تا کہ ان کے معاملات واضح طور پر منضبط ہو سکیں ورنہ افراتفری اور خون خرابہ ہوگا- جماعت بکھر جائے گی اور معاشرہ کبھی بھی منضبط نہیں ہو سکے گا- ایسے میں طاقتور ضعیف کو کھا جائے گا- کیونکہ لوگ مختلف طبائع اور خواہشات کے پتلے ہوتے ہیں- انہی میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو حق کو نہیں پہچانتے اور نہ ہی عدل کا معنی جانتے ہیں-

ارشاد خداوندی ہے:

’’یَادَاوٗدَاِنَّاجَعَلْنَاكَ خَلِیْفَةًفِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی‘‘(۱۰)

(اے داؤد علیہ السلام) ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشات کی پیروی نہ کرو)

اسی طرح پیغمبر آخرالزمان ﷺ کو حکم دیا:

''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاأَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَاتَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّاجَائَكَ مِنَ الْحَقِّ ''(۱۱)

(لہذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو)

اسلام کی آخری کتاب قرآن کریم نے جگہ جگہ ظلم کی ناپسندیدگی کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے- ارشاد ربانی ہے:

''وَاِنَّ الظَّلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْض وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ''(۱۲)

(ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ (دوست) ہیں جبکہ متقیوں کا ساتھی (دوست) اللہ ہے)

اسی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو ایک دوسرے کا دوست قرار دیکر متقیوں کو ان سے الگ کر دیا اور انہیں اپنی دوستی میں لے آئے- ارشاد ربانی ہے:

''اِنَّه' لَايُحِبُّ الظَّالِمِيْن وَلَمَنِ انْتَصَرَبَعْدَظُلْمِهٖ فَاُوْلٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِالْحَقِّ اُوْلٰئِكَ لَهُمْ عَذَابُ اَلِيْمُ ''(۱۳)

(اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جاسکتی ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں- ایسے لوگوں کیلئے دردناک عذاب ہے)

سورۃ الکھف میں ارشاد ہوا:

''اَمَّامَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّاِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا''(۱۴)

(جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اسے سزا دیں گے پھر اسے اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا)

علامہ ابن حزم ظلم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ولایحل الحکم الا بما انزل اللہ تعالی علی لسان رسول اللہ ﷺ وھوالحق و کل ماعداذلک فھوا جور وظلم لایحل الحکم به ویفسخ ابدااذاحکم به حاکم''(۱۵)

(فیصلہ تو جائز ہی وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زبانی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس کے مطابق ہو وہی حق ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ ناانصافی اور ظلم ہے اس کے مطابق حکم ناجائز ہے اگر حاکم نے اس کے مطابق حکم دیا تو وہ مفسوخ ہے۔

کتاب الٰہی سے ظلم کی ناپسندیدگی سے متعلق یہ ایک مختصر سی جھلک ہم نے پیش کی۔قرآن کریم اپنے ماننے والوں کو ظلم سے دور رکھنے کیلئے ظلم کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالقادر ابوفارس کہتے ہیں:

''ومن ھذاالابدمن ردع الظالم عن ظلمه والانتصاف للضعیف من القوی وتوضح وجه الحق عندلبسه وھذا لا یتحقق الابوجودقاضی یحکم بین الناس فی خصوماتھم ومنازعاتھم......لھذاکانت وظیفةالقاضی فی الاسلام وغیره من الشرائع الربانیة فریضة شرعیة وضرورة انسانیة''(۱۶)

یہیں سے ثابت ہوا کہ ظالم کو ظلم سے روکنے' طاقتور سے ضعیف کا حق لینے اور اشتباہ کی صورت میں حق کو ظاہر کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں اور یہ تمام (امور) قاضی کے وجود کے بغیر ممکن نہیں جو کہ ان کے مابین ان کے لڑائی جھگڑوں کا فیصلہ کرے......لہٰذا اسلام میں اور اسلامی شرائع کے حوالے سے قضاء شرعی فریضہ اور انسانی ضرورت ٹھہرتا ہے)

صاحب المرافعات الشرعیہ لکھتے ہیں:

''والقضاء ھوالسلطةالتی تفصل فی الحقوق عند الاختلاف 'وتلزم الناس بالعدل ولایتصوران یکون الناس

ملائکة لاتظالم ولااعتداء بینهم......فمارایناولاسمعناعن امة ترکت امورهافوضی اذاالخصومةمن الوازم الناس وطبیعة البشر''(۱۷)

(قضاء اس بااختیار طاقت کا نام ہے جو اختلاف کی صورت میں حقوق واضح کرتی ہے- اور عدل کے ذریعے ان کو لوگوں پر لازم کرتی ہے- یہ ناممکن ہے کہ لوگ فرشتے بن جائیں اور ایک دوسرے پر ظلم اور زیادتی نہ کریں- ہمارے خیال میں کسی بھی قوم نے امورِ زندگانی کو طوائف الملوکی کی حالت میں نہیں چھوڑا- جبکہ لڑائی جھگڑے انسانی زندگی اور جبلت بشریہ کا حصہ ہیں)

دنیاوی زندگی میں امن وامان' قانون کی حکمرانی' عدل وانصاف کی ضرورت واہمیت سے کوئی بھی متمدن قوم انکار نہیں کرسکتی- اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے وہ انسانی احتیاجات اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے رسولوں کے ذریعے مظلوموں کی دادرسی' قانون کی حکمرانی' مستند اور قابل عمل اخلاقی نظام کیلئے رہنما اصول فراہم کرنے کا اہتمام کرتا ہے- اور اپنی تعلیمات کو حکومتی اور رضاکارانہ دونوں ذرائع سے نافذ کر کے تحفظ دین' تحفظ جان ونسل اور تحفظ عزت ومال کو ممکن بناتا ہے-

اسلام پوری انسانیت کی سلامتی کا ضامن ہے- وہ جو قانون دیتا ہے وہ برحق ہے- قانون یا ضابطہ جس ذریعے سے دیا گیا ہے وہ قرآن ہے- اور قرآن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

''لَا یَأْتِیهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِیلٌ مِنْ حَکِیمٍ حَمِیدٍ''(۱۸)

(باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ ایک حکیم کی نازل کردہ ہے)

چونکہ یہ ایک دانا کی نازل کردہ تعلیمات ہیں ان میں باطل کی ملاوٹ نہیں ہوسکتی اس لیے یہ مکمل طور پر انسانی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کیلئے ایک قابل عمل طریقہ کار بتاتا ہے- وہ یہ کہ اسلام انسان سے بامقصد زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے- انسانی زندگی کو بامقصد بننے کیلئے اس کے حقوق کے تحفظ کا اہتمام ضروری ہے اس سلسلے میں قضاء ہی وہ طریقہ کار ہوسکتا ہے جس کے ذریعے حقوق کا تحفظ اور اللہ کے قانون کا نفاذ ہوسکتا ہے- یہی وجہ ہے کہ قضاء کو محکم فریضہ قرار دیا گیا-

امام شیرازیؒ فرماتے ہیں:

''ولان الظلم فی الطباع فلابدمن حاکم ینصف المظلوم

من الظالم فان لم یکن من یصلح للقضاء الاواحد تعین علیه ویلزمه طلبه واذا امتنع اجبرعلیه لان الکفایة لاتحصل الابه''(۱۹)

(اوراس وجہ سے کہ ظلم طباع انسانی کا خاصہ ہے-اسی وجہ سے حاکم مظلوم کو ظالم سے انصاف دلاتا ہے-اگر قضاء کی اہلیت رکھنے والا ایک ہی ہوتو اس پرعہدہ قضاء کی قبولیت فرض ہے اوراس کا طلب کرنااس پر لازم ٹھہرتا ہے-اگروہ قبولیت سے انکارکردے تو اسے مجبورکردیاجائے گا-اس لئے کہ تنفیذحق کاحصول اس کے ذریعے ہی ممکن ہے)

صاحب المغنی اسے فرض کفایہ قراردیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''القضاء من فروض الکفایات لان امرالناس لایستقیم بدونه فکان واجباً علیهم کالجهادوالامامة''(۲۰)

(قضاء فرض کفایہ ہے اس لئے اس کے بغیرلوگوں کے امورسیدھے نہیں ہوسکتے لہذا قضاءامامت اور جہاد کی طرح واجب ٹھہرتا ہے)

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''منصب القاضی فرض لانه ینصب لامامةامر مفروض وهوالقضاء''(۲۱)

(منصب قاضی فرض ہے اس لیے کہ وہ ایک فرض شدہ کام سے عہدہ براہونے کیلئے ہوتا ہے اوروہ ہے قضاء)

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''اعلم بان القضاء بالحق من اقوی الفرائض بعد الایمان باللہ تعالیٰ وهومن اشرف العبادات لاجله اثبت الله تعالی لآدم علیه السلام اسم الخلافةفقال جل جلاله''انی جاعل فی الارض خلیفة''واثبت ذلك داؤد علیه السلام فقال عزوجل''یاداؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض'' وبه امر کل نبی مرسل حتی خاتم الانبیاء علیهم الصلوة

والسلام قال "اِنَّا اَنْزَلْنَاالتَّوْرَاةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ" وقال اللہ تعالیٰ "وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَائَهُمْ" وهذا لان فی القضاء بالحق اظهار العدل وبالعدل قامت السموت والارض "(۲۲)

(جان لو کہ حق کے ساتھ فیصلہ ایمان باللہ کے بعد اہم ترین فرائض اور اہم ترین عبادات میں سے ہے۔ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کیلئے خلیفہ کا لفظ اختیار فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "میں زمین میں خلیفہ بنا کر بھیج رہا ہوں" اسی طرح اللہ عزوجل نے داؤد علیہ السلام کیلئے بھی یہی لفظ اختیار کرتے ہوئے فرمایا "اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا" اور یہی حکم ہر نبی اور رسول کو دیا۔ یہاں تک کہ خاتم الانبیاء ﷺ کو بھی یہی حکم ملا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ہم نے توریت کو نازل کیا اس میں ہدایت ہے اور روشنی بھی انبیاء اس سے فیصلے کرتے ہیں" اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے "اور تم ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ (احکام) کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کے خواہشات کی پیروی مت کرو" اور اس وجہ سے کہ حق کے ساتھ فیصلہ میں عدل کا اظہار ہوتا ہے اور عدل ہی کی وجہ سے زمین و آسمان (کائنات کے نظام) قائم ہیں)

قضاء کی یہی ضرورت اور اہمیت اسے فرض قرار دینے کا موجب بنی اس کی اہمیت حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خط سے واضح ہوتی ہے جو کہ انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا۔ اس خط کا آغاز اس طرح سے فرمایا:

"فان القضاء فريضة محكمة وسنة متبعة "(۲۳)

(نظام قضاء کا قیام ایک محکم فریضہ ہے اور ایسی سنت ہے جس کا ہمیشہ سے اتباع کیا گیا ہے)

حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین، تابعین اور تبع تابعین نے یہ فریضہ اسی انداز میں انجام دیا۔ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

"واجمع المسلمون على مشروعية نصب القضاء والحكم

بین الناس ''(۲۴)

(مسلمانوں کا منصب قضاء کی مشروعیت اور لوگوں پر اس کے فیصلوں کے نفاذ پر اجماع ہے)

البتہ اہل خوارج میں سے بعض منصب امامت اور منصب قضاء کے اس لئے قائل نہیں کہ ان کے خیال میں چونکہ دین کے احکام لازم ہیں جب وہ ان کی بجا آواری کر لیتے ہیں تو پھر قاضی اور حاکم کو ان کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوسکتی۔

یہ افلاطون کی خیالی دنیا کا یا کارل مارکس کی (Stateless Society) کا تصور تو ہوسکتا ہے کہ انسان از خود قانون کی پابندی کرے گا۔ اور دوسرے کے ساتھ ظلم و ناانصافی کا مرتکب نہیں ہوگا اور بغیر کسی مرکزیت کے وہ ایک دوسرے کے دست برد سے محفوظ ہوں گے اور ان کے معاملات چلتے رہیں گے۔ لیکن اس عملی دنیا میں اس کی مثال ناممکن ہے۔ یہاں تو ''ظلوماً'' ''جھولا'' جیسے انسان بستے ہیں نہ کہ فرشتے جن کا طعام' قیام' کلام اور معاملات زن وشو سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ اختلاط مع الانام سے واقف ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ناصر بن عقیل فرماتے ہیں:

''والواقع الفعلی من حیاۃ الناس فان طباع البشر مجبولۃ علی التظالم ومنع الحقوق والمفطورۃ علی التنازع والتخاصم وقل من ینصف الناس من نفسہ بالنزول علی حکم الحق والعدل اذا کان الامر کذلک فلا بدمن نصب الائمۃ والقضاء''(۲۵)

(انسانی زندگی کا امر واقعہ یہ ہے کہ انسانی طبیعت میں جبلی طور پر ظلم' حقوق کی خلاف ورزی اور فطری طور پر تنازعات اور جھگڑے موجود ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو از خود حق وعدل سے لوگوں میں انصاف کرتے ہیں جب معاملہ ایسا ہی ہو تو پھر حاکموں اور قاضیوں کے مناصب (کی ضرورت) سے کوئی مفر نہیں)

خلاصہ کلام یہ کہ قضاء انبیائے کرامؑ کی وہ سنت ہے جس کی وضاحت واہمیت قرآن کریم نے جگہ جگہ بیان فرمائی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کو بھی تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ لوگوں کے تنازعات نمٹانے کا حکم ملا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

''فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَاأُمِرْتَ وَلَاتَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاأَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ''(۲۶)

(اس لیے اے محمد ﷺ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو اور تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی سے قائم رہو- اوران لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو- اوران سے کہہ دو کہ میں اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں)

مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں اور ان کی بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کردوں جو تمہاری زندگیوں اور تمہارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں- میں خدا کا مقرر کیا ہوا قاضی اور جج ہوں' تمہارے درمیان انصاف کرنا میری ذمہ داری ہے''(۲۷)

ارشاد ربانی ہے:

''وَمَااخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ''(۲۸)

(اور تمہارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کا کام ہے)

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''العلم ثلاثة وماخلافهوفضل علم آية محكمة اوسنة قائمة اوفريضة عادلة''(۲۹)

(علم تین چیزوں پر مشتمل ہے- قرآن کریم کا علم' سنت رسول یا عدل کا فریضہ (قضاء) جو اسے کے علاوہ ہے وہ زائد ہے)

قضاء کے قیام سے معاشرہ پر جو مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا جائزہ علامہ علاؤالدین الطرابلسی نے کچھ اس طرح سے لیا ہے:

''واما حكمته فرفع التهارج ورد النوائب وقمع المظالم ونصر المظلوم وقطع الخصومات والامر بالمعروف والنهى عن المنكر''(۳۰)

(قضاء کی حکمت یہ ہے کہ اس کے قیام سے معاشرہ سے افراتفری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔مصائب اور مشکلات رفع ہوجاتے ہیں۔ظالموں، سرکشوں اور حق چھیننے والوں کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔مظلوم کی مدد ہوجاتی ہے تنازعات اور خصومات کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا ہوجاتا ہے)

اس سلسلے میں علامہ ابن قدامہؒ ایک جامع تقریر فرماتے ہیں:

''وفيه فضل عظيم قوى على القيام به واداء الحق فيه ولذلك جعل الله فيه اجراً مع الخطاء واسقط عن حكم الخطاء ولان فيه امراًبالمعروف ونصرة المظلوم واداء الحق الى مستحقه ورداً للظالم عن ظلمه واصلاحا بين الناس وتخليصاًلبعضهم من بعض وذلك من ابواب القرب ولذلك تولاه النبى ﷺ والنبياء قبله فكانوا يحكمون لامهم''(۳۱)

(اور جولوگ عدل کے قیام اور اس میں حق کی ادائیگی کی طاقت رکھتے ہیں ان کیلئے اس میں بہت بڑی فضیلت ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے اس میں غلطی کے ساتھ بھی اجر مقرر فرمایا۔اور نادانستہ غلط فیصلہ کرنے سے سزا معاف فرمائی۔اس لئے کہ اس میں امر بالمعروف، مظلوم کی مدد، مستحق کو اس کا حق دلانا، ظالم کو ظلم سے روکنا، لوگوں کے درمیان اصلاح اور لوگوں کو ایک دوسرے کی دست درازی سے نجات دلانا شامل ہیں اور یہی قرب الٰہی کی صورتیں ہیں اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ اور ان سے قبل انبیاء علیہم السلام اس منصب پر مامور رہے اور اپنی اپنی امتوں کے فیصلے کرتے رہے)

قضاء

قرآن کریم کے حوالے سے ہم بیان کرآئے ہیں کہ معاشرے میں عدل ہی کے قیام سے لوگوں کے جان ومال، عزت وآبرو اور حقوق کا تحفظ ممکن ہوسکتا ہے اور عدل کا قیام قضاء کے ادارے کے بغیر ناممکن ہے۔اسلامی تعلیمات نے اسے فرض قرار دے کر اس کی اہمیت اور بھی واضح کردی

ہے- رسول اکرم ﷺ نے تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ بنفس نفیس اس محکم فریضے کو انجام دیا اور اس مقصد کیل ء یا یک ادارے کی حیثیت سے اس کی بنیاد رکھی- مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی رسول اکرم ﷺ کو اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود فیصل ٹھہرایا- ہجرت کے بعد یہود کے جن تین قبائل بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریضہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ ہوا جسے میثاق مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ''جب کبھی کوئی جھگڑا یا کوئی باہمی اختلاف پیش آئے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا (۳۲)

اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیائے کرام کی طرح رسول اکرم ﷺ کو بھی اپنے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق فیصلہ کرنے کا فریضہ سونپا- چنانچہ ارشاد ہوا:

''اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ'' (۳۳)

(ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی تا کہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو)

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو احکامات خداوندی کا نفاذ قرار دے کر انہیں یہ فرض سونپا کہ وہ لوگوں کی تنازعات میں ان کے فیصلے احکامات الٰہیہ کے مطابق کریں اور لوگوں پر یہ بات واضح کر دی کہ رسول ﷺ کا جو بھی فیصلہ ہوگا اسے صدق دل سے تسلیم کر کے اس پر عمل درآمد کرو- اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو مسلمانوں میں سے نہیں رہو گے-

خداوند ذوالجلال کا ارشاد ہے:

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا'' (۳۴)

(اے محمد ﷺ) تمہارے رب کی قسم یہ (لوگ) کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو- اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کرتے ہوئے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں)

اس آیت کریمہ میں ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر عمل درآمد کی تلقین کی گئی ہے اور

دوسری طرف ان کے فیصلے پر دلوں میں کسی قسم کی کدورت اور تنگی نہ لانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنے تمام اختلافات اور تنازعات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے مطابق خوش اسلوبی کے ساتھ حل کرنے کے قابل ہوسکیں- کیونکہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی عدالت کے حکم کو تو مان لیتا ہے لیکن دل میں ایک کھٹک ضرور باقی رہتی ہے پھر وہ اس سے بڑی عدالت میں جاکر اپیل بھی دائر کرتا ہے-

مسلمانوں پر خداوند ذوالجلال نے یہ بات لازم کردی ہے کہ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ کے بتائے ہوئے ضابطے اپنائیں اور ان کے علاوہ دوسرے تمام ضابطے ناقابل قبول قرار دے کر سب کو طاغوت کہا- ارشاد ربانی ہے:

''قَدتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِالْوُثْقٰى لَانْفِصَامَ لَهَا''(۳۵)

(ہدایت گمراہی سے ممیز کردی گئی ہے جس نے طاغوت (اللہ کے نظریے کے علاوہ دوسرے نظریات) کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے مضبوط رسی کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والی نہیں)

علامہ ابن قیم طاغوت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''والطاغوت كل ماتجاوربه العبد حده من المعبوداو متبوع اومطاع' فطاغوت كل قوم من يتحاكمون اليه غير اللهورسوله'اويعبدونه من دون اللهاويتبعونه على غير بصيرةمن اللهاو يطيعونه فيما لا يعلمون انه طاعةالله''(۳۶)

(طاغوت ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے بندہ اپنے حدود سے تجاوز کرکے اپنے معبود متبوع اور مطاع سے سرکشی اختیار کرے- پس طاغوت ہر وہ چیز ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ حکم ٹھہرائی جائے یا اللہ کے علاوہ اس کی عبدیت کی جائے- یا اللہ کی رہنمائی کے بغیر اس کا اتباع کیا جائے- یا ناواقفیت کی وجہ سے ان امور میں اس کی اطاعت کی جائے جن (امور) میں اطاعت اللہ کیلئے (مخصوص) ہو)

مولانا مودودیؒ طاغوت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''طاغوت'' لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو- قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی وخداوندی کا دم بھرے- اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے- خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں- پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرمانبرداری ہی کو حق مانے مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے اس کا نام فسق ہے- دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرمانبرداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے- یہ کفر ہے- تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے- اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے اس کا نام طاغوت ہے- اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو'' (۳۷)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ظلم کو ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے- دنیا سے ظلم کو مٹانے کیلئے اس نے اپنے محبوب بندوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً قوانین دیئے اور ان کے ذمے یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ انسانوں کو اللہ کے قوانین پہنچائیں اور ان پر ان کو نافذ بھی کریں- تاکہ لوگ انہی ضابطوں کے مطابق امن آشتی کی زندگی گزار سکیں-

ارشاد خداوندی ہے:

''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ'' (۳۸)

(امن انہی کیلئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا)

سو خدا نے یہ بات واضح کر دی کہ امن وسکون ان کیلئے ہو سکتا ہے جو اسلامی قوانین کو صدق دل سے اپنے اوپر نافذ کریں- اپنی پسند اور ناپسند کو ترک کر دیں کیونکہ تمام امور کے اسرار ورموز خداوند تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں- وہی ان کے آغاز وانجام سے پوری طرح واقف ہے اور اسی کے ضابطوں کے نفاذ سے انسانیت ظلم سے نجات حاصل کر سکتی ہے- اللہ تعالیٰ مومنین کو مخاطب کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ لَّا يَكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ''(۳۹)

(کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہو)

اس آیت کا اطلاق پورے اسلامی نظام زندگی پر ہوتا ہے اس کی رو سے کسی مسلمان فرد، قوم، ادارے یا عدالت یا پارلیمنٹ یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اس میں وہ آزادی رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی خدا اور رسول کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبردار ہو جانے کے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کا مسلمان بھی ہونا اور اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رویوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً خدا اور رسول ﷺ کے آگے جھک جانا ہو گا اور جسے نہ جھکنا ہو اسے سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے (۴۰)

اس کی مزید وضاحت علامہ ابن کثیرؒ نے کچھ اس طرح سے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''وذلك اذاحكم اللّٰهورسوله بشئى فليس لاحد مخالفته ولا اختيار لاحدهھنا ولا راى ولا قول''(۴۱)

(اور وہ یہ کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ جس کسی معاملے کا فیصلہ کریں تو اس میں نہ تو کسی کو مخالفت کا حق ہے نہ اختیار اور نہ ہی کو اس میں رائے یا حجت دے سکتا ہے)

اسلام اپنے پیروکاروں کو عدل کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے:

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ''(۴۲)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ

داروں پر کیوں نہ پڑتی ہو)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ''(۴۳)

(اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان مکمل عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو- بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)

پہلی آیت میں یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ انصاف کی روش پر چلو بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو- تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے- تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل اور راستی قائم ہو- عدل کو اپنے قیام کیلئے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو(۴۴)

عدل وانصاف صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے دائرہ میں غیر مسلم بھی شامل ہیں- ارشاد خداوندی ہے:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى''(۴۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو- کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ- عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے)

یہاں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی اس مکمل انصاف وعدل (قسط) میں شریک کیا گیا جو کہ پہلے بظاہر صرف مسلمانوں کے درمیان نافذ کرنے کا کہا گیا تھا- اس میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ عدل وانصاف کا دامن تھامے رکھیں اور جو کچھ وہ اس معاملے میں کریں وہ محض خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ہو اس میں ذاتی مفاد اور ذاتی اور گروہی عناد کا کوئی عمل دخل نہ ہو- بلکہ اس نعمت غیر مترقبہ سے غیر مسلموں کو بھی سرشار کرو- عدل کے قیام اور اس کی کاملیت کے اعتبار سے ارشاد ہوا:

''وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ''(۴۶)

(تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے کوئی اس
کے فرامین کو بدلنے والا نہیں وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے)

دنیا میں عدل وانصاف اور حق وراستی کے مدعی تو سبھی ہیں لیکن عدل حقیقی اور انصاف کامل اور حق مطلق صرف اللہ کی کتاب اور اس کی شریعت میں ہے- جو نا قابل تغیر وتبدل ہے- وحی الٰہی سے ہٹ کر جن لوگوں نے عدل وانصاف کے مقاصد کو حاصل کرنا چاہا ہے وہ ہمیشہ ناکام رہے ہیں- اس لئے کہ انہوں نے عدل کا تصور ہمیشہ اپنے ناقص خیالات' فاسد قیاسات اور محض وہم گمان کی بنیاد پر قائم کیا اور وہ عدل وانصاف اور حق وراستی کے حقیقی اور کامل مفہوم کا ادراک رکنے سے ہمیشہ قاصر رہے- ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی پیروی اور ان کے ناقص تصورات عدل کا اتباع راہ راست سے گمراہ کرنے کے علاوہ اور کیا کرسکتا ہے- (۴۷)

قضاء سنت رسول ﷺ کے حوالے سے:

رسول اکرم ﷺ نے بعثت کے بعد تیرہ برس مکہ میں قیام فرمایا اور اس کے بعد جب ہجرت کا حکم ملا تو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے شیدائیوں کے ہمراہ مکہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ کو اپنا مسکن بنایا- اس ہجرت نے دعوت دین کے کام کو پھیلایا جس کے نتیجے میں متبعین رسول میں اضافہ ہوا- رسول اکرم ﷺ نے جاتے ہی ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی- اسی ریاست کے سب سے پہلے قاضی خود رسول اکرم ﷺ تھے- تبلیغ کا کام جاری رہا- گردونواح کے لوگ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوتے رہے اور وہ جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے جس کے نتیجے میں حکومت وسیع ہوتی چلی گئی- رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کے فیصلے وحی الٰہی کے مطابق کرنے کیلئے اپنے قریبی ساتھیوں میں سے بعض کو قضاء کے امور سونپے اور اس سلسلے میں ان کی تربیت فرمائی- ان کو فیصلہ کرنے کیلئے ایک بنیادی اصول دیا کہ وہ قانون الٰہی کے منشاء کے مطابق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کے مابین فیصلے کریں-

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اذاحکم الحاکم فاجتھدفاصاب فله اجران واذا حکم فاجتھد ثم اخطافله اجر''(۴۸)

(قاضی نے جب اجتہاد کے ذریعے فیصلہ کیا اور درست کیا تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر اجتہاد سے فیصلہ کیا اور غلطی کی تو ایک اجر ملتا ہے)

رسول اکرم ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں وحی الٰہی کو بنیاد اور معیار بناتے اور جس معاملے میں وحی نہ ہوتی اس میں اجتہاد فرماتے - چنانچہ فرمایا:

''(انی) انما اقضی بینکم بالری فیما لم ینزل علی فیه''(۴۹)

(جن معاملات میں وحی نازل نہیں ہوتی ان کا فیصل میں اپنی رائے سے کرتا ہوں)

ڈاکٹر محمد فاروق النبھان لکھتے ہیں:

''وکان یعتمد فی قضائه علی الوحی اولا ویعتمد علی الاجتهاد فیما لا وحی فیه''(۵۰)

(رسول اللہ ﷺ) اپنے فیصلوں میں سب سے پہلے وحی کو بنیاد بناتے تھے اور پھر جب وحی نہیں آتی تھی تو اجتہاد سے کام لیتے)

رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے قضاء کی اہمیت اور زیادہ واضح صورت میں سامنے آتی ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کی ہے - فرمایا:

''لا حسد الا فی اثنتین رجل اتاه الله مالا فسلطه علی هلکته فی الحق وآخر اتاه الله حکمة فهو یقضی بها ویعلمها''(۵۱)

دو امور ایسے ہیں جن میں حسد (رشک) کیا جا سکتا ہے - ایک تو اس شخص پر جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہو اور حق کے راستے میں اس کو خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہو اور دوسرا اس شخص پر جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت و دانائی سے نوازا اور وہ اس کے مطابق فیصلے بھی کرتا ہو اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتا ہو)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع رہتے ہوئے لوگوں کے تنازعات اور اختلافات کو طے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انہی احکامات کی تعلیم بھی دیتے ہیں تو یہی لوگ دراصل عدل خداوندی کو قائم رکھنے والے اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے والے ہیں - صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ان کی زندگی ہی میں اس فریضہ کو شریعت کی منشاء کے عین مطابق انجام دیا - صاحب تاریخ القضاۃ فی الاسلام فرماتے ہیں:

''ولمافتح اللہ علی المسلمین بعض الامصاربعث النبی ﷺ ولاۃ علیھافکان الوالی ھوالحاکم وھوالقاضی فبعث معاذبن جبل الی الیمن وعتاب بن اسیدالی مکۃفقضوا بین الناس فی حیاتہ ﷺ وعلی ھذہ الحال سارابوبکرؓ فکان یقضی بین الناس بالمدینۃ وولاتہ فی الامصارھم القضاۃ''(۵۲)

(جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بعض شہروں پر فتح دی تو رسول اللہ ﷺ نے وہاں والی مقرر فرمائے - یہ والی حاکم اور قاضی دونوں حیثیتوں سے کام کرتے تھے - چنانچہ معاذ بن جبلؓ کو یمن اور عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا والی مقرر فرمایا - انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فیصلے کیے - اسی طرح ابوبکر صدیقؓ بھی مدینہ میں خود لوگوں کے فیصلے کیا کرتے اور مختلف شہروں میں آپ کے والی ہی قاضی ہوا کرتے تھے)

رسول اکرم ﷺ نے قضاء کے اصول بھی واضح فرمائے - چنانچہ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انما انا بشر وانہ یاتینی الخصم ولعل بعضھم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انہ صادق فاقضی لہ فمن قضیت لہ بحق مسلم فانماھی قطعۃمن النارفلیحملھا اویذرھا''(۵۳)

(میں بھی آخر انسان ہوں - میرے پاس مدعی اور مدعی علیہ آتے ہیں سو شاید بعض (لوگ) بعض لوگوں سے زیادہ گویا اور باتونی ہوتے ہیں تو میں گمان کرتا ہوں کہ وہ سچا ہے - سو اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں - سو جس کو میں کسی مسلمان کا حق دلا دوں تو وہ اس کے حق میں دوزخ کا ٹکڑا ہے - چاہے اس کو اٹھا لے اور چاہے اس کو چھوڑ دے)

اور اور روایت میں ہے:

''انما انا بشر وانکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو ماسمع

منه فمن قضيت له من حق اخيه بشى فلايأخذمنه شيئا فانما اقطع له قطعةمن النار''(۵۴)

(میں بھی ایک انسان ہوتم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہواور شاید تم میں سے بعض لوگ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باتونی اور زبان آور ہوتے ہیں سوان سے جس طرح سنتا ہوں فیصلہ کر دیتا ہوں۔سو جس شخص کو اس کے بھائی کے حق سے کچھ کاٹ کر دلا دوں تو وہ اس میں سے کچھ بھی نہ لے وہ سوائے آگ کے ٹکڑے اور کچھ نہیں)

ان احادیث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قاضی ظاہر پر فیصلہ کرتا ہے۔خود رسول اکرم ﷺ نے ظاہری صورتوں کو دیکھ کر فیصلے فرمائے۔اگر کسی کے پاس اپنا جائز حق ثابت کرنے کیلئے ثبوت نہ ہواور اپنے معاملے کی اچھی طرح وضاحت بھی نہیں کرسکتا اور اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی چرب زبان ہوتو حق حقدار کی بجائے کسی اور کو مل سکتا ہے۔اس لئے مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اموال باطل طریقہ سے نہ لیں۔ارشاد خداوندی ہے:

''وَلَاتَاْكُلُوْااَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ''(۵۵)

(اور ایک دوسرے کے اموال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

''قضى رسول اللهﷺبيمين وشاهد''(۵۶)

(رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ سے قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

سى رسول اللهﷺباليمين مع الشاهدالواحد''(۵۷)

سول اللہ ﷺ نے ایک گواہ سے سے قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا)

حساسیت ونزاکت:

ریم جگہ جگہ اپنے ماننے والوں کو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے نفاذ اور عدل کے نے کا حکم دیتا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَااَنْزَلَ اللّٰهُ''(۵۸)

(لہذا تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ''(۵۹)

(اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو)

ارشاد خداوندی ہے:

''وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ''(۶۰)

(اور اگر فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو)

یہ اور اس جیسی بہت ساری آیات اس بات کی نشاندھی کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور افراد پر فرض بھی عائد کرتے ہیں کہ وہ عدل کے اس فریضے کی انجام دہی بھی کریں۔لیکن جب ہم احادیث کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں متعارض قسم کی احادیث ملتی ہیں۔ایک وہ جن میں قضاء کی نزاکت اور حساسیت کی وجہ سے منصب قضاء قبول کرنے سے ڈرایا گیا ہے اور دوسری وہ جن میں عہدہ قضاء قبول کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔اس سلسلے میں ہمیں سلف کے ہاں بھی دو آراء ملتی ہیں۔بعض لوگوں کے خیال میں منصب قضاء قبول کرنا ''آ بیل مجھے مار'' کے مترادف ہے یعنی منصب قضاء قبول کرنا آخرت خراب کرنے کا باعث بن سکتا ہے اور اس لئے بھی کہ منصب قضاء ایک نہایت دقیق اور مشکل امر ہے۔اس لئے اس سے اجتناب مستحسن سمجھا گیا جبکہ بعض کے نزدیک اس فریضے کی انجام دہی اخروی کامیابی کا ضامن ہے۔ذیل میں ہم ان دونوں امور کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''القضاۃثلثۃواحد فی الجنۃ واثنان فی النار فاما الذین فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضی بہ ورجل عرف الحق وجارفی الحکم فھو فی النارورجل قضی للناس علی جھل فھو فی النار''(۶۱)

(قاضی تین قسم کے ہیں۔ایک قسم جنتی ہے اور دوسری دوزخی، سو جنتی وہ شخص ہے جس نے حق پہچان لیا اور اس پر فیصلہ کیا اور دوسری قسم وہ ہے جس نے حق پہچان لیا اور (جان بوجھ کر) حکم میں ظلم کیا یعنی ناحق فیصلہ کیا سو وہ آگ میں جائے گا اور تیسرا وہ شخص ہے جس نے بے علمی سے فیصلہ کیا سو وہ بھی دوزخ میں جائے گا)

حدیث بالا میں تین قسم کے قاضیوں کا تذکرہ ہے۔ایک وہ قاضی جو علم اور عدل کے معیار

پر پورا اترتا ہو- دین اسلام میں اسی کو فضیلت حاصل ہے- وہی اخروی سعادت کا مستحق ٹھہرتا ہے- دوسرے دو قسم کے قاضی دوزخ میں ہوں گے- ان میں سے ایک حق جانتے ہوئے ناحق فیصلہ کرنے والا اور دوسرا بے علم قاضی جو کہ حق سے غافل ہوتا ہے اور ظلم کا ارتکاب کر لیتا ہے- قیامت کے روز ان کا جو حشر ہوگا اس سے مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے- لہذا منصب قضاء کیلئے علم اور راست بازی بھی ضروری ہے اور ظلم سے اجتناب بھی- کیونکہ قضاء کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ حق دار کو اس کا حق ملے اور ظلم کا خاتمہ ہو جبکہ محولہ بالا دونوں قسم کے قاضی خود ہی ظلم کا سبب بن جاتے ہیں جو فرد قرآن وسنت میں ادراک نہ رکھتا ہو اور جائز و ناجائز میں تفریق نہ کر سکتا ہو- اسے اگر فیصلہ کرنے کی ذمہ داری سونپ دی جائے تو ظلم کے سوا اور کیا حاصل ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے قاضی کی اہلیت میں حلال وحرام کا علم رکھنا' اجتہاد کر سکنے کی قابلیت کو مستحب اور اس کے ساتھ عقل کو لازم قرار دیا ہے- جبکہ محدثین کے نزدیک قاضی کیلئے ضروری ہے کہ وہ حلال وحرام کا علم بھی رکھتا ہو اور درجہ اجتہاد پر بھی فائز ہو'' (۶۲)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغیر سکین'' (۶۳)

(جسے لوگوں میں قاضی بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح ہوا)

دوسری روایت میں ہے:

''من ولی القضاۃ فقد ذبح بغیر سکین'' (۶۴)

(جس کو منصب قضاء پر مامور کیا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح ہوا)

امام خصاف اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وھذا لان السکین توثر فی الظاھر والباطن جمیعا والذبح بغیر سکین ذبح بطریق الخنق والغم ونحو ذلك وانه یؤثر فی الباطن دون الظاھر فکذا القضاء لایوثر فی الظاھر فانه فی الظاھر حیاۃ وفی الباطن ھلاك'' (۶۵)

(اس ہلاکت کی وجہ یہ ہے کہ چھری کا اثر ظاہر اور باطن دونوں پر ہوات ہے حالانکہ چھری کے بغیر بھی کسی کو مارا جا سکتا ہے- مثلاً گلا گھونٹ کر یا دم گھونٹنے سے مگر اس کا اثر باطن پر ہوتا ہے- ظاہر پر نہیں- قضاء کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے ظاہر تو کوئی اثر نہیں دکھاتا بلکہ بظاہر تو یہ زندگی ہے لیکن باطن میں ہلاکت)

اس کی دلیل کے طور پر امام خصافؒ نے حضرت عائشہؓ سے مروی یہ حدیث نقل کی ہے:

''یجاء بالقاضی العدل یوم القیامۃفیلقی من شدۃ الحساب مایؤدانہ لم یکن قضی بین اثنین''(۶۶)

(قیامت کے دن عادل قاضی کو(خدا کے سامنے) پیش کیا جائے گا-جس کو اپنے سخت حساب کا سامنا ہوگا-وہ تمنا کرے گا کہ کاش اس نے فریقین میں کوئی فیصلہ نہ کیا ہوتا)

یہی حدیث مسند احمد بن حنبل میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس طرح مروی ہے-حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''لتاتین علی القاضی العدل یوم القیامۃساعۃ یتمنی انہ لم یقض بین اثنین فی تمرۃ قط''(۶۷)

(عادل قاضی کے اوپر قیامت کے روز ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ تمنا کرے گا کہ کاش اس نے کبھی فریقین کے درمیان ایک کھجور کا بھی فیصلہ نہ کیا ہوتا)

مندرجہ بالا احادیث اور اسی طرح اسی مضمون کی دوسری احادیث پیش نظر رکھتے ہوئے ظاہری طور پر جو اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ یہ کہ قاضیوں کو قیامت کے روز جن تکالیف اور مصائب کا سامنا ہوگا وہ اتنی سخت ہیں کہ بعض محدثین نے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے قضاء سے اجتناب کرنے کو مستحب قرار دیا ہے-ان محدثین میں امام احمد بن حنبلؒ کا نام بھی شامل ہے-اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عادل قاضی کی باز پرس کی یہی حالت ہوگی تو پھر فریضہ عدل میں کوتاہی کرنے والے قاضی کی کیا حالت ہوگی؟

اس ڈر اور خوف کا اظہار حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس جواب سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کو اس وقت دیا تھا جب حضرت عثمان نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو منصب قاضی سنبھالنے کا مشورہ دیا-عبداللہ بن موہبؓ سے روایت ہے:

''ان عثمان بن عفانؓ قال لابن عمر اذھب فاقض بین الناس قال او تعافینی یا امیرالمؤمنین فقال فماتکرہ من ذلك وقد کانہ ابوك یقضی قال انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من کان قاضیاً فقضی بالعدل فبالحری ان ینقلب منہ کفافا''(۶۸)

(حضرت عثمان بن عفانؓ نے ابن عمرؓ سے کہا تم جاؤ اور لوگوں کے فیصلے کرو-

عبداللہ بن عمرؓ نے کہا اے امیر المؤمنین مجھے اس عہد سے معاف فرمائیں۔ انہوںؓ نے کہا کہ تم اسے کیوں ناپسند کرتے ہو؟ جبکہ تمہارے والد قاضی رہے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص قاضی ہوا اور انصاف سے فیصلہ بھی کیا پھر بھی اس کیلئے قاضی بننے سے بہتر ہے وہ بقدر ضرورت روزی پر (اگر ممکن ہو تو) گزارہ کرے)

یہ واقعہ شیخ ابوالحسن بن عبداللہ بن الحسین کی کتاب میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

''وقدنقل عن عثمان بن عفان انه قال لعبدالله بن عمر بن الخطاب ؓ''اقض بين الناس قال:''لاقضى بين رجلين مابقيت''قال لتفعلن''قال لاافعل''قال فان اباك كان يقضى'قال كان ابى اعلم منى واتقى''(۶۹)

(حضرت عثمان بن عفانؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ سے فرمایا کہ تم قاضی بن کر لوگوں کے فیصلے کرو۔ تو انہوں (عبداللہ بن عمرؓ) نے کہا جب تک میں زندہ ہوں میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہیں کروگا (حضرت عثمانؓ) نے فرمایا کہ تمہیں کرنا پڑے گا (حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے) کہا میں نہیں کرتا۔ فرمایا (حضرت عثمانؓ نے) تمہارے والد تو کیا کرتے تھے۔ کہا (حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے) کہ میرے والد مجھ سے بڑے علم والے اور پاک باز انسان تھے)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں قسم کی تعلیمات کی روشنی میں عمل درآمد کی نوعیت کیا ہوگی؟ رسول اللہ ﷺ نے تو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ لوگوں کے فیصلے بھی فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہم سب کیلئے نمونہ ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر پیغمبروں نے قضاء کا فریضہ انجام دیا ہے۔ قرن اول میں رسول اللہ ﷺ کے مشہور ترین صحابہؓ میں سے اکثر نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ بعد کے ادوار میں دیکھنے آیا ہے کہ امت میں سے بعض اہل علم نے عہدہ قضاء قبول کرنے سے انکار بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ تر امام ابوحنیفہؒ کا نام لیا جاتا ہے۔ صاحب تاریخ القضاء فی الاسلام رقمطراز ہیں:

''ونجد بالمقابل ان عدد كثيراًمن كبارالعلماء فى اواخر العصر الاموى وبداية العصر العباسى رفضواالقضاء ومن

هؤلاء الذين رفضوالقضاء ابوحنيفةنعمان وروى ابن عابدين ان اباحنيفة دعى الى القضاء ثلاث مرات فابى وضرب فى كل مرة ثلاثين سوطافلمان كان فى المرة الاخيرة قال'حتى استشير اصحابى 'فاستشار ابايوسى فقال له:لوتقلدت لنفعت الناس' فنظر اليه ابواحنيفة نظر المغضب وقال:ارايت لو امرت ان اعبرالبحر سباحة اكنت اقدر عليه فكانى بك قاضياً''(٧٠)

(اس کے مقابلے میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عہد اموی کے اواخر اور عہد عباسی کے اوائل میں اکثر بڑے بڑے علماء نے قضاء کو قبول کرنے سے انکار کیا- انکار کرنے والوں میں سے ایک امام ابوحنیفہؒ بھی (شامل) ہیں- ابن عابدین سے مروی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو تین مرتبہ قضاء کیلئے کہا گیا تو انہوں نے انکار کیا اور ہر مرتبہ ان کو تیس کوڑوں کی سزا ہوئی- آخری مرتبہ انہوں نے کہا میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گا- تو انہوں نے امام ابو یوسفؒ سے مشورہ کیا- اس پر انہوں نے (امام ابو یوسفؒ) نے کہا کہ اگر آپ قبول کر لیں تو لوگوں کا فائدہ ہوگا تو امام ابوحنیفہؒ نے انہیں غصے سے دیکھا اور کہا کہ تمہارے خیال میں اگر مجھے دریا کو تیرتے ہوئے عبور کرنے کیلئے کہا جائے تو کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ میری یہی حالت قضاء کی ہوگی'' یہ واقعہ منصور کے عہد کا ہے)

صاحب التشریع والفقہ فی الاسلام یہ واقعہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ارادمنه عامل مروان على العراق يزيد بن عمر بن هبيرة' ان يلى له القضاء الكوفة فابى فضربه مائة وعشرة اسواط فى كل يوم عشرة وهوعلى الامتناع فلمارای تصميمه على الرفض خلى سبيله''(٧١)

(مروان کے گورنر یزید بن ہبیرۃ نے ارادہ کیا کہ کوفہ کے قضاء کا منصب امام ابوحنیفہؒ سنبھال لیں تو انہوں نے انکار کیا- پس اس نے ان کو (ابوحنیفہؒ

کو) روزانہ دس کوڑوں کے حساب سے ایک سو دس کوڑے لگوائے اور وہ انکار کرتے رہے- جب اس نے ان کے انکار کو عزم صمیم کے ساتھ پایا تو چھوڑ دیا)

اس واقعہ سے کہیں بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ یہ سختی عہدہ قضاء کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی- شیخ محمد الخضری اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ کوڑوں سے مارنا انتہائی توھین آمیز ہے اور کوئی عاقل ایسا نہیں کرتا کہ منصب قضاء جیسی اہم ترین امارت اسی کو سونپ دے جس کی اس طرح سے توہین کی گئی ہو- ہوسکتا ہے کہ امیر کے ذہن میں ان سے نفرت پیدا ہوئی ہو اس لئے ان کو سزا دی ہو-

جبریہ طلاق کے سلسلہ میں امام مالکؒ کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ وہ جبریہ طلاق کو واقع نہیں سمجھتے تھے- یہ واقعہ عباسیوں کے دور میں محمد بن عبداللہ بن حسن (النفس الزکیہ) کے خروج کے وقت کا ہے- خلیفہ وقت منصور نے اس مسئلہ کو بیان کرنے سے امام مالکؒ کو منع کیا- لیکن امام صاحب نے انکار فرمایا تو مدینہ کے گورنر جعفر بن سلیمان نے ان کو (کوڑوں سے) مارا-

امام مالکؒ کے واقعہ کو اگر امام ابوحنیفہؒ کے واقعہ سے ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی سزائیں سیاسی تھیں اس وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے انکار کی امکانی صورت سیاسی ہی ہوسکتی ہے- اگر یہ فرض بھی کیا جائے کہ قضاء کی عدم قبولیت کی وجہ سے سزا دی گئی تھی تو پھر بھی واضح ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں حاکم وقت کی عدالتی امور میں مداخلت کے زیادہ امکانات ہوسکتے ہیں- اس وجہ سے عہدہ قضاء کو قبول کرنا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں تھا-

اس بحث سے قطع نظر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ صحابہؓ تابعین اور ان کے بعد کے علماء اور صلحاء نے عہدہ قضاء کو قبول فرما کر لوگوں کے درمیان اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کئے-

پس ثابت ہوتا ہے کہ ترہیب اور ترغیب کا مقصد انسان کو اس اہم ادارے کی حساسیت سے آگاہی ہوسکتا ہے- اس کی حیثیت کا تعین ہم ترغیب اور ترہیب کو جنت اور دوزخ کے تصورات کے ساتھ ملا کر کرسکتے ہیں- جنت اور دوزخ کے تصور سے انسان کے اعمال میں توازن قائم کیا جاسکتا ہے- اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ترہیب اور ترغیب کے اس تصور سے قضاء کے معاملات میں یکسانیت اور توازن مقصود ہے- اسی حوالے سے قضاء امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حصہ بنتا ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرائض میں شمار ہوتا ہے-

صاحب ظفر اللاضی لکھتے ہیں:

''فاعلم ان لاشك فی وجوب الدخول فی القضاء علی من لایغنی عنه غیره ولاشك فی تحریمه علی من لایصلح له اما لقصورفی علمه اوفی ادراکه اوفی دینه لانه تلبس بمالا یصلح له ودخل فیمالیس هومن شانه''(۷۲)

(جان لوکہ قضاء کے فرائض کی انجام دہی ہراس شخص پرلازم ہے جس کے علاوہ اس کی انجام دہی کا اہل کوئی نہ ہواور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ ہراس شخص پرحرام ہے جواس کی اہلیت نہیں رکھتا چاہے علم کی سمجھ یادین میں کسی کمی کی وجہ سے ہواس لئے کہ وہ ان چیزوں میں پڑ گیا جونہ تو اس کا کام ہے اورنہ اس کیلئے یہ صحیح ہے۔

ان احادیث اورواقعات کا تجزیہ کرنے کے بعددو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱- منصب قضاء قبول کرنا اورلوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا انتہائی مشکل امر ہے جس میں مشکلات زیادہ ہیں اگر اس سے بچنے کا کوئی طریقہ ممکن ہوتو مسلمانوں کواس سے بچنا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے منصب قضاء قبول نہ کرنا مستحب قرار دیا ہے۔

۲- قضاء ایک مشکل ترین امرضرور ہے لیکن اس امت کا بنیادی فریضہ ہے اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ کر کے حقیقی عدل قائم کرے۔ اوراسی وجہ سے بعض اہل علم نے اسے برسوں کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔

ان تمام فرمودات کے مجموعی تجزیئے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دراصل رسول اللہ ﷺ کے ان فرمودات کا بنیادی مقصد منصب قضاء کی اہمیت اور نزاکت کو اجاگر کرنا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ منصب قضاء مشکل ہے اور تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع رہتے ہوئے فیصلے ہوں۔ اس سلسلے میں صاحب معین الحکام فرماتے ہیں:

''وقال بعض اهل العلم:هذاالحدیث دلیل علی شرف القضاء وعظیم منزلته وان المتولی له مجاهد لنفسه وهواه وهودلیل علی فضیلة من قضی بالحق اذا جعله ذبیح

الحق استحانالتعظم له المثوبةامتناناًفالقاضی لمااستسلم لحکم اللہ وصبرعلی مخالفة الاقارب والاباعد فی خصوماتهم فلم یاخذه فی اللہ لومة لائم حتی قادهم الی امر الحق وکلمة العدل وکفهم عن دواعی الهوی والعناد جعل ذبیح الحق للہوبلغ به حال الشهدا الذین لهم الجنة وقدولی رسول اللہﷺعلی بن ابی طالبؓ ومعاذ بن جبل ومعقل بن یسار رضی اللہعنہماالقضاء فنعم الذابح ونعم المذبحون فالتحذیر الوارد من الشرع انماهوعن الظلم لاعن القضاء فان الجورفی الاحکام واتباع الهوی فیه من اعظم الذنوب واکبر الکبائر''(۷۳)

(بعض اہل علم نے کہا ہے کہ یہ حدیث قضاء کے شرف اور بلند رتبے کا ثبوت فراہم کرتی ہے-اس لئے کہ قضاء پر مامور فرد اپنے نفس اور خواہشات کے خلاف جہاد کرتا ہے اور جو برحق فیصلے کرتا ہے اس کی فضیلت کیلئے یہی حدیث دلیل ہے- کیونکہ بطور امتحان تو وہ ''شہید حق'' ہے اور بطور احسان اس کا اجر نہایت عظیم ہے-پس قاضی اللہ کے حکم کا مطیع ہوااور اپنے پرائے کے تنازعات میں ان کے مخالفت کی پرواہ نہ کی اور اللہ کے حکم میں کوئی عار محسوس نہیں کی- یہاں تک کہ اس نے لوگوں کی سچے فیصلے کی طرف راہنمائی کی اور انہیں نفسانی خواہشات اور آپس کی دشمنی سے دور رکھا- اسی وجہ سے اسے خدا اسے شہید حق قرار دیا گیااور اس نے شہداء کا مقام حاصل کیا-جن کا ٹھکانہ جنت کے سوا کچھ نہیں- رسول اللہﷺ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب' حضرت معاذ بن جبلؓ اور معقل بن یسارؓ کو قاضی مقرر فرمایا- کیا بہترین شہادت دلانے والے تھے اور کیا ہی بہترین شہیدان حق تھے یہ لوگ- پس شریعت میں جو ممانعت آئی ہے وہ ظلم سے ہے نہ کہ قضاء سے-اس لئے کہ فیصلہ کرنے میں ظلم اختیار کرنا اور خواہشات کی پیروی کرنا ہی دراصل کبیرہ گناہوں میں سے ہے)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''بعثنی رسول اللہ ﷺ الی الیمن قاضیاًفقلت یارسول اللہ: ترسلی وأنا حدیث السن ولاعلم لی بالقضاء فقال ان اللہ سیھدی قلبك ،ویثبت لسانك فاذا جلس بین یدیك الخصمان فلاتقضین حتی تسمع من الآخر کماسمعت من الاول فانه احری ان یتبین لك القضاء''(۷۴)

(رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن کا قاضی مقرر کر کے بھیجا میں نے کہا یارسول اللہ ﷺ آپ مجھے بھیج رہے ہیں حالانکہ قضاء کے بارے میں میرا تجربہ کم ہے- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا تیرے دل کو سیدھی راہ دکھادے گا اور تیری زبان کو مضبوط رکھے گا- جب مدعی اور مدعی علیہ تمہارے سامنے بیٹھیں تو اس وقت فیصلہ مت کرو جب تک دوسرے کی بات اسی طرح نہ سنو جس طرح تم نے پہلے کی بات سنی- فیصلے کی گتھی سلجھانے کے لیے یہی سب سے زیادہ عقل مندی کی بات ہے-)

ایک اور روایت میں ہے:

''ان علیاً بعثه رسول اللہ ﷺ الی الیمن قاضیاقال یارسول اللہ ﷺ بعثتنی بینھم وانا شاب لاادری ماالقضاء قال فضرب رسول اللہ ﷺ فی صدری وقال''اللھم اھدہ وثبت لسانه''(۷۵)

(جب حضرت علیؓ کو رسول اللہ ﷺ نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو حضرت علیؓ نے کہا یارسول اللہ ﷺ آپ نے مجھے لوگوں کا قاضی مقرر فرمایا حالانکہ میں جوان ہوں- اور فیصلہ کرنا نہیں جانتا- حضرت علیؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ''اے اللہ اس کو ہدایت دے اور اس کی زبان کو مضبوط کر''

حضرت علیؓ کا رسول اکرم ﷺ کے ساتھ دینی اور نسبتی قرب سب کو معلوم ہے اگر قضاء کا منصب اتنا ہی خطرناک ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کم از کم ان کو اس منصب پر مامور نہ فرماتے- یہاں تو ان

کیلئے دعا کی جاتی ہے- اگر چہ وہ خود کو نا تجربہ کار ظاہر کرتے ہیں جبکہ تجربہ کاری میں غلط فیصلوں کا امکان زیادہ ہوتا ہے- تو گویا رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کیلئے ایسی جگہ پسند فرمائی جس میں اخروی نقصان کے سوا اور کچھ بھی نہیں- یہ شان رسالت سے بہت بعید ہے-

حضرت معاذؓ سے متعلق حدیث اس بات کو مزید واضح کرتی ہے:

''عن الحارث بن عمرویرفعه الی معاذ لمابعثه رسول اللہ ﷺ الی الیمن قال له کیف تقضی اذاعرض لك قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد قال اقضی بسنة رسول اللہ ﷺ قال فان لم تجد فی رسول اللہ ﷺ قال قلت اجتهد برای ولا آلو قال فضرب رسول اللہ ﷺ صدره قال والحمدللہ الذی وفق رسول اللہ ﷺ لما یرضی رسول اللہ ﷺ''(۷۶)

(حارث بن عمروؓ سے حدیث مروی ہے- وہ اس حدیث کو حضرت معاذ سے مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے آپ کو یمن کی طرف (قاضی بنا کر) بھیجا تو فرمایا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوگا- کہا کہ میں قرآن کے مطابق فیصلہ کروں گا- فرمایا اگر تم قرآن میں اس کے مطابق حکم نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ کہا کہ سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا- فرمایا کہ اگر سنت میں بھی اس کا حکم نہ پاؤ- کہا کہ میں اپنے رائے سے اجتہاد کروں گا اور اپنی کوشش میں کوئی کمی نہیں کروں گا- سو رسول اللہ ﷺ نے آپ کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ سب تعریفیں اللہ واسطے کہ جس نے رسول کے ایلچی کو اس بات کی توفیق دی جس سے پیغمبر خدا راضی ہو)

یہ انتہائی مشہور و معروف حدیث ہے اور مختلف امور میں حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہے بلکہ اصول اجتہاد میں یہ حدیث بنیاد کا درجہ رکھتی ہے- یہاں اس حدیث کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سوال پر حضرت معاذؓ کا جواب اس بات کی نشاندھی کرتا ہے وہ وہ خاصے تربیت یافتہ تھے اور رسول اکرم ﷺ کے فیصلوں پر کڑی نظر رکھتے تھے- تب ہی تو انہوں نے بعینہ وہی جواب دیا جو

رسول اکرم ﷺ کو مطلوب تھا اور قضاء کا عہدہ قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ ایک اہم پہلو یہ کہ اجتہاد چاہیے قانون بنانے میں ہو یا قانون کے نفاذ میں ہر دو صورتوں میں اس کی حیثیت ایک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں مقاصد شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انتہائی کوشش کی جاتی ہے اور یہی کوشش سعادت کا باعث بنتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث پہلے گزر چکی ہے جس میں ارشاد ہے کہ جب قاضی اجتہاد کرتا ہے اور درست ہو تو اس کو دہرا اجر ملتا ہے اور اگر وہ اجتہاد کرنے میں غلطی کر جاتا ہے تو اس کیلئے ایک اجر ہے۔ یہ حدیث قضاء سے متعلق دوسری احادیث کی بظاہر معارض ہے۔ اور وہ یہ کہ قاضی چاہے اس کا فیصلہ صحیح ہو یا غلط دونوں صورتوں میں اجر کا مستحق ہے بشرطیکہ وہ اللہ کے حکم کے تابع رہتے ہوئے فیصلہ کرے۔ تو پھر عذاب اور سختی چہ معنی دارد۔ کیونکہ قاضی نے تو ''الحب للہ'' اور ''البغض للہ'' کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہے۔ ایسی صورت میں وہ یقیناً اجر کا مستحق گردانا جائے گا نہ کہ عذاب اور مواخذے کا۔ ہاں اگر وہ فیصلہ کرنے میں غفلت برتتا ہے یا اس کا فیصلہ ظلم پر مبنی ہو تو یہ اسلامی تعلیمات سے انحراف ہوگا۔ اس کا عذاب اور مواخذہ دوسرے امور کی نسبت سخت ہوگا۔

صاحب معین الحکام فرماتے ہیں:

''واعلم ان کل ماجاء من الاحادیث التی فیها تخویف ووعید فانماهوفی حق قضاة الجور والعلماء والجهال الذین یدخلون انفسهم فی هذالمنصب بغیر علم ففی هذین الصنفین جاء الوعدید''(۷۷)

(جان لو کہ جتنی احادیث تخویف اور وعید (قضاء) کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں تو وہ ظالم قاضیوں، علماء اور ان جاہل لوگوں سے متعلق ہیں جو بغیر علم کے یہ منصب قبول کرتے ہیں۔ یہ وعید ان دونوں اصناف ہی کے سلسلے میں ہے)

جہاں تک بعض صحابہ کرامؓ کے منصب قضاء سے اجتناب کرنے کا تعلق ہے تو وہ بالکل واضح ہے۔ اگر امت میں سے کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہ بار گراں اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا اور اس کے نزدیک منصب قضاء کی قبولیت خواہ مخواہ اپنے سابقہ اعمال پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے تو یہ اس کا انفرادی معاملہ ہے نہ کہ اجتماعی۔ جتنا کوئی عہدہ اہم ہوگا اس کی ذمہ داری بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ عہدہ قضاء کی قبولیت کے حق میں اور مخالفت میں جتنی بھی احادیث وارد ہوئی ہیں ان تمام کے مضامین سے یہ بات

مترشح ہوتی ہے کہ منصب قضاء ایک انتہائی اہم ذمہ داری ہے جو ان لوگوں کو قبول کرنی چاہیے جو معروف ومنکر میں تمیز اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں- مزاج شریعت کے عالم ہوں کیونکہ قاضی کے پاس مدعی اور مدعی علیہ دونوں دلائل دیتے ہیں اور قاضی کو بہت سارے فیصلوں میں اختیار تمیزی استعمال کرنا ہوتا ہے- اس اختیار کے استعمال کیلئے علم، عقل اور قوت فیصلہ تینوں انتہائی اہم اور ضروری ہیں ورنہ اختیار تمیزی کا استعمال ایک طرف معاشرے میں فساد کا موجب بنے گا اور دوسری طرف خود قاضی کیلئے وبال جان ہوگا- رسول اکرم ﷺ عدل وانصاف کی اہمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''المقسطون عندالله يوم القيامةعلى منابر من نورعن يمين الرحمن عزوجل وكلتايديه يمين''(٧٨)

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدل وانصاف کرنے والے قیامت کے روز نور کے منبروں پر ہوں گے- یہ منبر رحمٰن کی داہنی جانب قائم ہوں ے گے اور رحمٰن کے دونوں ہاتھ دائیں ہاتھ ہیں- شیخ ابوالحسن ''یمین الرحمٰن'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وقوله يمين الرحمن معناه فى الحالة الحسنة والمنزلة الرفيعة''(٧٩)

(رحمٰن کے دائیں ہاتھ کا معنی یہ کہ وہ اچھی حالت اور بلند درجہ پر (فائز) ہوں گے)

عدل وانصاف قائم کرنے والوں کے لیے جس اجر کا تذکرہ اس حدیث میں ہوا ہے وہ عدل کرنے والوں سے متعلق تمام احادیث کی وضاحت کیلئے کافی ہے- اس لئے کہ جب قاضی عدل قائم کرے گا تو اس سے اللہ تبارک وتعالی خوش ہوں گے اور خداوند تعالی کی یہی خوشی اس کی دنیوی اور اخروی فلاح کیلئے کافی ہے-

ہم اس موضوع کو صاحب معین الحکام کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں- وہ فرماتے ہیں:

''اعلم ان اكثر المؤلفين من اصحابنا وغيرهم بالغوافى الترهيب والتحذير من الدخول فى ولاية القضاء' وشددوا فى كراهةالسعى فيهاورغبوافى الاعراض عنها والنفور

والهرب منها حتى تقررفى اذهان كثير من الفقهاء والصلحاء ان من ولى القضاء فقد سهل عليه دينه والقى بيده الى التهلكة ورغب عماهوالافضل وساء اعتقادهم فيه، وهذاغلوفاحش يجب الرجوع عنه، والتوبة منه، والواجب تعظيم هذالمنصب الشريف ومعرفة مكانته من الدين ، فيه بعثُ الرسول وبالقيام به قامت السموت والارض وجعله النبى عليه الصلاةوالسلام من النعم التى يباح الحسدعليها-فقد جاء من حديث ابن مسعودعليه الصلاةوالسلام" لاحسد الافى اثنتين"رجل اتاه الله مالا فسلطه على هلكته فى الحق ،ورجل اتاه الله الحكمة فهو يقضى بها ويعمل بهاوقدجاء من حديث عائشةؓ قال"هل تدرون من السابقون الى ظل الله يوم القيامة؟قالواالله اعلم ورسوله ،قال الذين اذااعطواالحق قبلوه واذاسئلوه بذلوه-واذاحكموالمسلمين حكموا،كحكمهم لا نفسهم، وقال عبدالله بن مسعود لان اقضى يوماًاحب الى من عبادة سبعين سنة ومراده انه اذا قضى يوما بالحق كان افضل من عبادة سبعين سنة فكذلك كان العدل بين الناس من افضل اعمال البر واعلى درجات الاجر قال الله تعالى وان حكمت فاحكم بينهم بالقسط ان الله يحب المقسطين ، فاى شئى اشرف من محبةالله تعالى "(٨٠)

(جان لوکہ ہمارے بعض مؤلفین نے ولایت قضاء قبول کرنے سے ڈرانے میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے اور لوگوں کو اس سے اعراض کرنے، ڈرانے اور بھاگنے کی ترغیب میں اتنی شدت دکھائی کہ بہت سے مصلحین اور فقہاء کے اذہان میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جس کو منصب قضاء سپرد ہوا، وہ دین سے دور ہوگیا اور وہ اپنے ہاتھ سے ہلاکت میں گرا کیونکہ انہوں نے خدا کی عبادت جو

افضل چیز تھی اس سے منہ موڑا اور دنیاداری میں پھنس گئے- اس سلسلے میں ان کا عقیدہ خراب ہوا- یہ ایسی غلطی ہے جس سے رجوع کرنا اور توبہ کرنا لازم ہے- کیونکہ اس اعلیٰ منصب کی تعظیم اور دین میں اس کے مقام کو پہچاننا لازم ٹھہرتا ہے- اسی (قضاء) کے لیے تو پیغمبر مبعوث ہوئے اور زمین و آسمان اسی کی وجہ سے قائم ہیں- رسول اللہ ﷺ نے قضاء کو ایسی نعمت قرار دیا ہے جس پر رشک کرنا جائز ہے جیسا کہ حدیث ابن مسعودؓ میں ہے "دو شخص قابل رشک ہیں ایک وہ جسے اللہ نے دولت دی پھر اس کو حق کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق دی- اور دوسرا وہ جسے اللہ نے علم سے نوازا اور وہ اس کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتا اور عمل کرتا ہو- حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن اللہ کے سائے میں کون سب سے پہلے ہوں گے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں- فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جب ان کو حق دیا جائے تو قبول کرتے ہیں اور جب ان سے مانگا جائے تو سخاوت کرتے ہیں اور جب مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کرتے ہیں گویا وہ اپنے لئے فیصلہ کر رہے ہیں..... حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میرا ایک دن کا فیصلہ کرنا ستر سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے- اس طرح لوگوں کے درمیان عدل (کا قیام) نیکی کے اعمال اور اجر کے لحاظ سے بہتر ٹھہرا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو- بے شک اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے تو کون سی وہ چیز ہے جو اللہ کی محبت سے زیادہ اچھی ہو)

متمدن اقوام کے ہاں قضاء حکومت کا ایک اہم ادارہ ہوتا ہے- یہی اقوام کسی نہ کسی طور پر معاملات میں کافی حد تک توازن اور انصاف قائم کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ان کا تصور انصاف اسلامی نظام قضاء کا کسی بھی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا- پاکستان میں مروجہ نظام قضاء انگریزوں کا وضع کردہ ہے- یہ نظام ایک غلام قوم کیلئے رائج کیا گیا تھا- پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد سے اس نظام کے اصلاح کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی ہے- لیکن تا حال اس میں کامیابی

ممکن نہیں ہوسکی ہے- انصاف کی فراہمی کے اس نظام کو اسلامی بنانے کیلئے بہت زیادہ تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی- بلکہ چند اہم تبدیلیاں لانے سے اسلامی نظام عدل کے تقاضے بآسانی پورے کیے جاسکتے ہیں-

۱- عدل کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ پورے نظام کی اساس اسلامی قوانین پر بھی رکھی جائے- اس لئے کہ جزوی طور پر قوانین کے نفاذ سے کسی بھی صورت میں اسلامی نظام عدل کے تقاضے پورے نہیں کیے جاسکتے-

۲- کسی بھی قانون کے نفاذ کیئے نہ صرف اس قانون کے جاننے والے درکار ہوتے ہیں بلکہ اس قانون کی روح کو سمجھنے والے ایسے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے جو انصاف کی فراہمی کو یقینی بنا سکتے ہیں- اس لئے اسلامی قوانین کے اجراء کیلئے وہ افراد درکار ہوں گے جو اس قانون کو نہ صرف جانتے ہوں بلکہ صدق دل سے اسے تسلیم بھی کرتے ہوں اس لئے اسلامی قانون کے نفاذ کیلئے اہلیت عالم مسلمان ہی کی ہوگی- اس وجہ سے غیر مسلم اور غیر عالم افراد (مسلمانوں کی حد تک) اہلیت سے خارج قرار پائیں گے- قرآن کریم کا بھی اس سلسلے میں واضح حکم ہے- ارشاد ربانی ہے:

''وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا''(۸۱)

(اللہ تعالیٰ نے کافروں کیلئے مؤمنین پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی)

قرآن کریم کا مسلمانوں کے اوپر غیر مسلموں کی ولایت سے متعلق ارشاد ہے:

''اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ آمَنُوْا بِمَآاُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآاُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْااِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْاُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْابِه''(۸۲)

(اے نبی ﷺ) تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعوی تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے- اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کیلئے طاغوت (نہ ماننے والوں) کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت (نہ ماننے والے) سے انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا)

البتہ غیر مسلموں کیلئے علیحدہ جج مقرر کیے جاسکتے ہیں- غیر مسلموں کیئے علیحدہ جج مقرر کرنے

سے متعلق جواز قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے عیاں ہے- ارشاد ربانی ہے:

''فان جاؤك فاحكم بينهم او اعرض عنهم''(۸۳)

(پس اگر (کفار) آپ کے پاس آ جائیں تو ان کے درمیان فیصلہ کرو یا ان سے اعراض کرو)

صاحب القضاء فی عہد عمر اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''اذااعرض الحاكم المسلم عن الحكم بين الكفار فلابدان يتحاكموا الى اهل ملتهم''(۸۴)

(جب مسلمان حاکم کفار کے مابین فیصلہ کرنے سے انکار کرے تو ان کیلئے اپنے ہم مذہب قاضی سے فیصلہ کرانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ غیر مسلم ججوں کو غیر مسلموں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کیلئے مامور کیا جائے- امام ابوحنیفہؒ غیر مسلموں کے ان اہل دین کی حد تک قضاء کے قائل ہیں-(۸۵)

عدل کیلئے اسلام راسخ عقیدے پر زور دیتا ہے- اعمال کا محور عقیدہ ہی ہوتا ہے- اسی لئے عقیدہ جتنا مضبوط ہوگا فیصلہ اتنا ہی واضح دوٹوک اور احکام الٰہی کے تابع ہوگا- جہاں کمزوری تو درکنار ایمان ہی نہ ہو وہاں امید کس بات کی؟ قاضی/جج کے اکثر فیصلے اس کے اختیار تمیزی پر منحصر ہوتے ہیں- قاضی اگر غیر مسلم ہو تو وہ اپنی سوچ کے تابع رہتے ہوئے اپنا اختیار تمیزی استعمال کرے گا- جبکہ مسلمان اپنی سوچ میں بھی اپنے آپ کو حکم الٰہی کا پابند سمجھے گا اور خداوند تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے تصور سے لیس ہو کر فیصلہ کرنے میں احتیاط برتے گا-

۳- قضاء کے معاملات ان افراد کے سپرد کرنے چاہئیں جو واجبی عقل نہیں بلکہ عقل سلیم کے مالک ہوں یعنی وہ عقل جس کے ذریعے حق اور باطل میں تمیز ممکن ہو-

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں:

''ولايكتفى بالعقل الذى يتعلق به التكاليف من عمله بالمدركات الضرورية حتى يكون صحيح التميز جيد الفطنة بعيدا من السهو والغفلة يتوصل بذكائه الى ايضاح ما اشكل وفصل ما اضل''(۸۶)

(اس (قضاء) میں وہ واجبی عقل بھی ناکافی ہے جس کے ضروری ادراک کی

وجہ سے وہ صرف مکلّف ہی ٹھہرتا ہے جب تک کہ صحیح التمیز انتہائی سمجھدار، غفلت اور بھول سے مبرا نہ ہو اور اپنی زکاءت سے مشکلات کو حل اور رکاوٹ کو ختم کرسکتا ہو۔ یعنی معاملات کے گتھیوں کو سلجھا سکتا ہو)

۴۔ عہدہ قضاء کیلئے جج / قاضی کا عادل ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ عادل سے مراد وہ فرد ہے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ گناہ صغیرہ پر اصرار کرنے والا نہ ہو اوامر کو پورا کرنے والا اور منہیات سے اجتناب کرنے والا ہو۔

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں:

''کہ عدالت ہر قسم کی ولایت میں ضروری ہے عدالت سے مراد اس کا صاف گو ہونا، امانت دار ہونا، محارم اور گناہوں سے بچنے والا، شک وشبہ سے بالاتر، خوشی اور غصہ میں اعتدال والا ہو۔ اسی طرح دینی اور دنیاوی امور میں بامروت ہو'' (۸۷)

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''اهلية القضاء تدور مع اهلية الشهادة'' (۸۸)

(قضاء کی اہلیت شہادت کی اہلیت کے ساتھ مشروط ہے)

ارشاد خداوندی ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا'' (۸۹)

(اللہ تمہیں امانات ان کے اہل افراد کو دینے کا حکم دیتا ہے)

قضاء کا مقصد عدل کا قیام ہے جو کہ غیر عادل کے ذریعے ممکن نہیں۔ مستند ائمہ کرامؒ کے بیان کردہ مؤقف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی امام یا فقیہ کسی نااہل اور غیر عادل قاضی کے قضاء کو جائز نہیں سمجھتا۔

حوالہ جات

۱۔ قرآن کریم: ۱۸:۵۴

۲۔ قرآن کریم: ۷۷:۳۶

۳۔ قرآن کریم: ۳:۱۱۰

۴۔ محمد صدیق حسن خان، نواب، ظفر اللاضی بما یجب فی القضاء علی القاضی، ص ۱۰۷، المکتبۃ السلفیۃ، لاہور: ۱۳۰۷ھ/ ۱۹۴۸ء

۵۔ قرآن کریم: ۵۷:۲۵

۶۔ قرآن کریم: ۲:۲۱۳

۷۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن، المقدمۃ، ص ۳۳، دارالفکر بیروت، تاریخ ندارد

۸۔ Azad, Ghulam Murtaza, Judicial System of IslamP.I, Islamic Research Institute Islamabad, 1987.

۹۔ ناصر بن عقیل، الدکتور، المرافعات الشرعیۃ، ص ۴۸، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء

۱۰۔ قرآن کریم: ۳۸:۲۶

۱۱۔ قرآن کریم: ۵:۴۸

۱۲۔ قرآن کریم: ۴۵:۱۹

۱۳۔ قرآن کریم: ۴۲:۴۰-۴۲

۱۴۔ قرآن کریم: ۴۲:۲۱

۱۵۔ ابن حزم، علی بن احمد بن سعید، المحلی، ۹:۳۶۲، دارالآفاق الجدیدۃ، بیروت: تاریخ ندارج

۱۶۔ ابو فارس، محمد عبدالقادر، القضاء فی الاسلام، ص ۶

۱۷۔ ناصر بن عقیل، المرافعات الشرعیۃ، ص ۵

۱۸۔ قرآن کریم: ۴۲:۳۲

۱۹۔ شیرازی، ابواسحاق، ابراہیم بن علی، المھذب علی مذہب الشافعی، ۲:۲۸۹، مطبعۃ عیسی البابی، مصر: تاریخ ندارج

۲۰۔ ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، المقدسی، المغنی، ۹:۳۴، مکتبہ الریاض: ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء

۲۱۔ الکاسانی، بدائع الصنائع، ۷:۱

۲۲۔ سرخسی، ابی بکر محمد بن احمد، شمس الائمہ، المبسوط ۱۶:۵۹-۶۰، دار المعرفۃ، بیروت: ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء

۲۳۔ الکاسانی، البدائع الصنائع، ۷:۹.

۲۴۔ ابن قدامۃ، المغنی، ۹:۳۴

۲۵۔ ناصر بن عقیل، الدکتور، القضاء فی عھد عمر بن الخطاب، ص ۵۷

۲۶۔ قرآن کریم: ۴۲:۱۵

۲۷۔ مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ۴:۴۹۶، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور: ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء

۲۸۔ قرآن کریم: ۴۲:۱۰

۲۹۔ ابن القیم، الجوزیۃ، ابی عبداللہ محمد بن ابی بکر، اعلام الموقعین عن رب العالمین، ۱:۸۷، مطبعۃ السعادۃ، مصر: ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء

۳۰۔ الطرابلسی، علی بن خلیل، معین الحکام فیما یتردد بین الخصمین من الاحکام، ص ۷، و بھامشہ لسان الحکام، قندھار، تاریخ ندارج

۳۱۔ ابن قدامۃ، المغنی، ۹:۳۴

۳۲۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل، عماد الدین، البدایۃ والنھایۃ، ۳:۲۲۵، دار ابن کثیر، بیروت: تاریخ ندارج

۳۳۔ قرآن کریم: ۴:۱۰۵

۳۴۔ قرآن کریم: ۴:۶۵

۳۵۔ قرآن کریم: ۲:۲۵۶

۳۶۔ ابن القیم، اعلام الموقعین، ۱:۵۰

۳۷۔ مودودی، تفہیم القرآن، (حاشیہ ۲:۲۸۶)، ۱:۱۹۶

۳۸۔ قرآن کریم: ۶:۸۲

۳۹۔ قرآن کریم: ۳۳:۳۶

۴۰۔ مودودی، تفہیم القرآن، ۴:۹۸-۹۹

۴۱۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل، عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، ۳:۴۹۰، سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء

۴۲۔ قرآن کریم: ۴:۱۳۵

۴۳۔ قرآن کریم: ۵:۴۲

۴۴۔ مودودی، تفہیم القرآن، ۱:۴۰۶

۴۵۔ قرآن کریم: ۵:۸

۴۶۔ قرآن کریم: ۶:۱۱۵

۴۷۔ غازی، محمود احمد، ادب القاضی، (اردو) ۳:۱۱۵، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد: ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

۴۸۔ بخاری، صحیح، ۹:۱۳۳، مطبوعات محمد علی صبیح، مصر، ابوداؤد، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۶۸۲، مسلم، صحیح، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۷۶

۴۹۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۴:۱۵

۵۰۔ النبہان، محمد فاروق، الدکتور، نظام الحکم فی الاسلام، ص ۶۱۷

۵۱۔ بخاری، صحیح، ۹:۱۲۶، بیہقی، السنن الکبریٰ، ۱۰:۸۸، (کتاب ادب القاضی)

۵۲۔ محمد بن محمد بن عرنوس، تاریخ القضاۃ فی الاسلام، ص ۱۱، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ، بمصر

۵۳۔ مسلم، صحیح، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۷۴

۵۴۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۴:۶۸۴

۵۵۔ قرآن الکریم: ۲:۱۸۸

۵۶۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۶۸۸، مسلم، صحیح، (کتاب الاقضیۃ، ۲:۷۴

۵۷۔ الترمذی، ابی عیسی محمد بن عیسی، سنن، (کتاب الحکام)، ۳:۶۲۷، دار عمران بیروت، تاریخ ندارج

۵۸۔ قرآن الکریم: ۵:۴۸

۵۹۔ قرآن الکریم: ۴:۵۸

۶۰۔ قرآن الکریم: ۵:۴۲

۶۱۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۶۸۲

۶۲۔ الکاسانی، بدائع الصنائع، ۷:۳

۶۳۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۶۸۲، الترمذی، سنن، (کتاب الاحکام)، ۳:۶۱۴

۶۴۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۶۸۲

۶۵۔ صدر الشہید، حسام الدین، عمر بن عبدالعزیز، شرح ادب القاضی للخصاف، ۱:۱۴۶، حققہ محی ہلال السرحان، وزارۃ الاوقاف، عراق

۶۶۔ صدر الشہید، حسام الدین، عمر بن عبدالعزیز، شرح ادب القاضی للخصاف، ۱:۱۳۶

۶۷۔ احمد بن حنبل، مسند، ۶:۷۵، دار الفکر، بیروت: تاریخ ندارد

۶۸۔ الترمذی، سنن، (کتاب الاحکام)، ۳:۶۱۲

۶۹۔ النباھی، ابوالحسن بن عبداللہ، کتاب المرقبۃ لعلیا فیمن یحق القضاء وافیاء الشھور بتاریخ قضاۃ الاندلس، ص ۱۱، المکتب التجاری، بیروت۔

۷۰۔ محمد صادق، دلیل القضاء الشرعی، ۱:۶۳۲

۷۱۔ مناع القطان، التشریع والفقہ فی الاسلام تاریخا ومنھجا، ص ۲۰۶

۷۲۔ محمد صدیق حسن خان، ظفر اللاضی، ص ۱۰۷

۷۳۔ الطرابلسی، علاؤالدین، معین الحکام، ص ۸

۷۴۔ ابوداؤد، امام، سنن، (کتاب الاقضیۃ)، ۲:۶۸۳

۷۵۔ سابق السید، فقہ السنۃ، ۳:۳۹۱، دار الکتب العربی، بیروت: ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء

۷۶۔ ابن القیم، اعلام الموقعین، ۱:۲۰۲

۷۷۔ الطرابلسی، علاؤالدین، معین الحکام، ص ۸

۷۸۔ البیھقی، احمد ابن الحسین، السنن الکبریٰ، ۱۰:۸۷-۸۸ (کتاب ادب القاضی) نشر السنۃ، ملتان

۷۹۔ النباھی، تاریخ قضاۃ الاندلس، ص ۳

۸۰۔ الطرابلسی، علاؤالدین، معین الحکام، ص ۷-۸

۸۱۔ قرآن الکریم: ۴:۱۴۱

۸۲۔ قرآن الکریم: : ۶۰

۸۳۔ قرآن الکریم: ۵:۴۲

۸۴۔ ناصر بن عقیل، الدکتور، اقضاء فی عھد عمر بن الخطاب، ص ۲۰۶

۸۵۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۶۵

۸۶۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۶۵

۸۷۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۶۵

۸۸۔ الکاسانی، البدائع الصنائع، ۷:۳

۸۹۔ قرآن الکریم: ۴:۸۵